سلسلہ مطبوعات ۳۱

تاریخِ اسلام

(ایک معروضی مطالعہ)

مولانا عبید اللہ سندھی

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

باسمہ تعالی

حرفِ اول

جو اقوام تاریخ کے مد و جزر پر نظر رکھتی ہیں اور معروضی صورتحال کو اپنے داخلی احساسات کی بجائے حقائق کی نظر سے دیکھتی ہیں وہ اپنے حال اور مستقبل میں بھی درست زاویہ نظر اختیار کرنے کے قابل ہوتی ہیں جبکہ اس کے برعکس اپنی ذاتی خواہشات اور شخصی پسند و ناپسند کے نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ہمیشہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔

تاریخ اسلام کے ساتھ ہمارے مؤرخین کی اکثریت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، اس نے تاریخ کو چند شخصیات کی سوانح بنا کر رکھدیا ہے، شخصی خوبیوں سے تاریخ شاندار اور ذاتی خامیوں سے تاریخ داغدار جانی جانے لگی، اور اسی وجہ سے ہم فکری طور پر معلق ہو کر رہ گئے ہیں کہ ماضی سے تعلق جوڑے بنا بات بنتی نہیں اور دوسری طرف مبینہ تاریخ قبول کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے اس تضاد نے ہمارے افکار کے ارتقائی سفر کو بھی شدید طور پر متاثر کیا ہے۔

تاریخ اسلام میں ابن خلدون پہلی نمایاں شخصیت ہیں جنہوں نے معروضی انداز فکر اپنانے کی ضرورت کو اجاگر کیا لیکن ان کی تجویز کردہ راہ پر بعد میں آنے والے مئورخین کم ہی مائل ہوئے۔ برعظیم کی عظیم انقلابی شخصیت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دیگر فکری میدانوں کی طرح تاریخ اسلام کے حساس موضوع کی بابت جس طرح تجزیاتی انداز فکر اختیار کیا ہے، اس سے نہ صرف کئی گرہیں کھلتی ہیں بلکہ تاریخ اسلام کے بارے میں احساس کمتری کی بجائے ایک نئی فکری توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے انداز فکر پر اپنے رویوں کو استوار کیا جائے اور حالات کی معروضی تعبیر کو بھی مناسب مقام دیا جائے۔

چیئرمین

سلسلہ مطبوعات (۳۱)

تاریخ اسلام ایک معروضی مطالعہ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

مضامین ایک نظر میں

تاریخ اسلام ایک معروضی مطالعہ ______ 5
قرآن اور اجتماعیت ______ 6
قریش کی اجتماعیت ______ 9
قریش کی امتیازی حیثیت ______ 11
قریش کا تمدن ______ 11
دنیا کا مشکل ترین مسئلہ ______ 12
رسول اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ______ 13
مکی عہد ______ 14
مدنی دور ______ 16
قریش کے تصور قومیت کی اصلاح ______ 17
ردانقلاب کی ناکام کوشش ______ 19
قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافت راشدہ ______ 19
جماعت صحابہ میں اختلاف رائے ______ 21
خانہ جنگی کی حقیقت ______ 21
عربوں کی قومی حکومت اور بنوامیہ کا عروج ______ 25
عباسی دور اور نیم آزاد سلطنتیں ______ 29
عربی دور حکومت کا جائزہ ______ 30
عجم کی اہمیت ______ 32
عجمی عہد حکومت ______ 35
قومی جمہوری تحریکات کی تخم ریزی ______ 35
قومی جمہوری دور ______ 36
اسلامی بین الاقوامیت کا مستقبل ______ 36

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اسلام۔ایک معروضی مطالعہ

بدقسمتی سے ایک طویل زمانہ سے ہمارے اہل علم تاریخ کو انفرادی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ یہ مرض ہمارے ہاں ظالم بادشاہوں کے دور کی یادگار ہے۔ جبر کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ جماعت کی بجائے فرد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور واقعات کے تغیر وتبدل کو اجتماعی رویوں کی بجائے چند اشخاص کے کردار پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری تاریخ کی کتابیں، قوموں کی مجموعی زندگی اور ان کے ارتقاء وزوال پر بحث کرنے کی بجائے بادشاہوں اور ممتاز افراد کے حالات کی کھتونیاں بن گئی ہیں انفرادیت پسندی کا یہ رجحان ہے جس نے ہمارے اہل علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے۔

چنانچہ قوموں کی زندگی اور ان کی ترقی میں جماعت کو جو اہمیت حاصل ہے، ہمارے اہل علم اس پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو مکہ کی اجتماعی زندگی، قریش کا قومی نظم ونسق، قُصَیٰ کے عہد سے قریش کی تنظیم وتوسیع کے حالات جن کا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کے مشن سے بہت گہرا تعلق ہے وہ ان باتوں کو سرے سے پیش نظر نہیں رکھتے ان کے ہاں نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت پر صرف اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ ساری نسل انسانی میں ایک مکمل اور برتر انسان پیدا کرے۔ ہر عالم کے سامنے سیرت نبوی کا بس یہ موضوع ہوتا ہے جسے وہ اپنی علمی استعداد اور مخصوص فکری رجحان کے مطابق پیش کرتا ہے۔ چنانچہ صرف اس طرز پر ہمارے ہاں بڑی کثرت

سے سیرت کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

لیکن اس کے برعکس ہم قومی زندگی میں فرد کی بجائے انسانی اجتماع کو اہم مانتے ہیں اور ہم نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ بھی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم، یورپ کی سیاست کا مطالعہ اور شاہ ولی اللہ کا فکریہ چیزیں ہی ہیں جنہوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی بنادیا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اجتماعیت کیلئے لادینیت ضروری نہیں ہے۔

قرآن اور اجتماعیت

اس فیصلے کا میرے افکار پر پہلا اثر یہ ہوا کہ میں نے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لئے ضروری قرار دیا۔ مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور میں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا کہ قرآن شریف کو اس طرح سمجھے بغیر اسے دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر قرآن شریف کی تعلیم کا لب لباب (خلاصہ) صرف یہ ہو کہ وہ ایک اکمل ترین انسان کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور بس، اس لئے ساری دنیا کو یہ پیغام سننا چاہیئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ اور مقتدا (پیشوا) کو اکمل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی اور خاص طور پر مسیحی قومیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برتر ثابت کریں گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کا جو ہمہ گیر مقصد ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

برعکس اس کے، میں اب فرد کی بجائے جماعت پر زور دیتا ہوں اور انفرادیت کے برعکس اجتماعیت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی ''دعا'' کا پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ مکہ میں قریش کی اجتماعی حیثیت وجود میں آئی۔ کیونکہ قریش کا فقط یہ اجتماع ہی دین ابراہیمی کا محافظ اور اس کی اشاعت کرنے والا بن سکتا تھا البتہ ضرورت تھی اب ایسے فرد کی جو ان کو دینی تعلیم دے اور ان میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ کام رسول

اللہﷺ نے انجام دیا۔اب دنیا کی دوسری اقوام، رسول اللہﷺ اور آپ کی تعلیمات سے قریش (صحابہ) ہی کے ذریعہ متعارف ہوسکیں، اس لئے آپ کا تعلق باقی دنیا سے قریش کے واسطہ سے ہوا، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقوام عالم نے اسلام کو رسول اللہﷺ کی ذات اقدس کے ذریعہ ہی نہیں جانا تھا بلکہ وہ اس اجتماعی تحریک کی بدولت بھی، جس میں قریش پیش پیش تھے، اسلام سے واقف ہوئیں، یعنی اسلام کو سمجھنے کیلئے صرف اور صرف رسول اللہﷺ کی ذات اقدس پر تمام زور ڈالنے کی بجائے اس اجتماعی تحریک کو بھی سامنے رکھنا چاہئے جو اس ذات اقدس کے اردگرد ظہور پذیر ہوئی تھی، اسلام کو اس طرح سمجھنے سے میرے بہت سے عُقدے (گرہیں) حل ہو گئے۔

قریش کے معاملے میں بھی میں ان میں سے کسی خاص گروہ کی خصوصیت اور اس کے امتیاز کا قائل نہیں رہا ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''الائمۃ من قریش'' یعنی قریش میں سے امام ہوں گے ایک اور روایت میں آیا ہے کہ بارہ سردار ہوں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔اس بیان سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہاں قریش کا بحیثیت مجموعی ذکر کیا گیا ہے۔قریش میں سے کسی خاص خاندان کو مخصوص نہیں کیا گیا لیکن بدقسمتی سے ہم نے چیزوں کو اجتماعی طور پر سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور انفرادیت کے رجحان نے ہمارے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔

یہ اجتماعیت اور اجتماعی فکر ہی کا اثر ہے کہ میں سورۃ بقرہ کی آخری آیت ''لا نفرق بین احدٍ من رسلہ'' (ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے) سے یہ سمجھا ہوں کہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء پر ایمان لائیں۔ان انبیاء میں ایک فرد اکمل رسول اللہﷺ ہیں، چنانچہ جماعت انبیاء سے مکمل قطع نظر صرف اور صرف رسول اللہ کی سیرت پر غور کرنا میرے نزدیک کافی نہیں۔غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہﷺ کے شخصی اوصاف میں اس قدر انہماک کرتے ہیں کہ آپ کی تربیت یافتہ جماعت کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہتی ہے۔ہمارے اس غلط تخیل کو درست کرنے کیلئے قرآن شریف کا ایک اشارہ کافی ہے۔سورۃ فتح

میں ''محمد رسول اللہ'' کے ساتھ ساتھ ''والذین معہ'' بھی ارشاد ہوا ہے یعنی آپ کی تمام کامیابی کو آپ کی جماعت کا کام بتایا گیا ہے اس کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں ایک مشہور روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ''مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر رہے گی'' اس کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ''ماانا علیہ واصحابی'' (یعنی جس طریقے پر میں اور میرے اصحاب ہوں گے، اس پر چلنے والی جماعت حق پر ہوگی) نقل کیا گیا ہے۔

ہمارے اس فکر کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے جو قرآن عظیم نے ہمیں سکھائی ہے۔ یہ دعا سورۃ فاتحہ میں مذکور ہے۔ اس میں ''صراط مستقیم'' کی تفسیر ''صراط الذین انعمت علیہم'' سے کی گئی ہے یعنی سیدھا راستہ وہ ہے کہ جس کے چلنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ ان کا تعین خود قرآن مجید نے کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک ''الذین انعمت علیہم'' انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی جماعتیں ہیں۔ اس سے زیادہ قرآن مجید کے اجتماعی تصور کے حق میں اور کیا دلیل ہو سکتی ہے لیکن معلوم نہیں کیوں ہماری توجہ ادھر نہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اجتماعیت سے بے التفاتی برتی اور انفرادیت کے دلدل میں پھنس گئے۔

سورہ جمعہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے متعلق یہ تصریح کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کے پہلے مخاطب ''امیین'' ہیں۔ امیین سے مراد عرب کے وہ قبیلے ہیں جنہوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعاء کی تھی کہ ہماری نسل سے امت مسلمہ پیدا کی جائے اور یہ ''گھر'' یعنی خانہ کعبہ اس کا منبع اور مرکز ہو۔ ظاہر ہے اس امت کو ایک نبی کی ضرورت تھی جو دین ابراہیمی کی صحیح معنوں میں تعلیم دے اور اسے تعلیم و تزکیہ کے ذریعے اس قابل بنا دے کہ وہ ابراہیمی دین، دنیا کی تمام قوموں تک پہنچا سکیں۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ قریش کی اصلاح کر سکیں، ان کو تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کر کے ان کو اقوام عالم میں اسلام کا نقیب (علمبردار) اور اس کی نشر و اشاعت کا حامل بنائیں۔

قریش کی اجتماعیت

بے شک قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن عراق اور پھر فلسطین تھا لیکن قریشی عربوں کے ساتھ مل کر عرب بن چکے تھے۔ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ سردار ہوں گے۔ ہم اس پیش گوئی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اولاد اسماعیل کے ذریعہ عرب میں ابراہیمی دین کی اشاعت ہوگی اور آگے چل کر ان کے بارہ سرداروں کی وساطت سے سرزمین عرب حنفی ملت کا مرکز بنے گی۔

تورات کی اس پیش گوئی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعاء کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد ''قصی'' نام کا ایک سردار قریش کے منتشر قبیلوں کو مکہ معظمہ میں آباد کرتا ہے وہ ان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظم دیتا ہے، ان کے مختلف قبیلوں کو مختلف کام سپرد ہوتے ہیں، ''دارالندوہ'' بنتا ہے، جس میں سب جمع ہو کر اپنے فیصلے کرتے ہیں، حج اور باہر سے آنے والوں کیلئے باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ گویا تمہید ہے خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کی۔

قصی بن کلاب کی یہ جماعت اپنے آپ کو حضرت ابراہیم ﷺ کی اولاد میں سے سمجھتی تھی اور حضرت ابراہیم محض اسماعیلی عربوں کے جداعلی نہ تھے بلکہ مسیحی اور موسوی ملتیں بھی ان کو اپنا پیشوا مانتی تھیں۔ اس لئے قصی کی یہ جماعت محض عربوں کی سرداری پر اکتفاء کرنا نہیں چاہتی تھی، اس کے بڑے بلند حوصلے تھے، یہ ایک طرف تو عرب قبائل کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش میں تھی اور دوسری طرف عراق وشام تک کے علاقوں میں اپنے تجارتی قافلوں کے ذریعے اثر ورسوخ پیدا کر رہی تھی اس کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ ان سب قوموں کو یکجا کر کے ایک مجمع الاقوام بنائے اور اس کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہو۔ اس جماعت میں خاندانی روایات کے طور پر یہ خیال نسلا بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنا دے گا۔ یہی جذبہ بنی اسرائیل میں بھی موجود تھا چنانچہ اس بنیاد پر بنی اسماعیل

اور بنی اسرائیل دونوں خاندانوں میں باہمی رقابت بھی تھی لیکن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور کسی کو ان کے برابر ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا ان کے نزدیک وہی ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا مصداق تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو بنی اسرائیل تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں نے ابراہیمی دین کو سب قوموں کا دین بنانے کی بجائے فقط، ایک خاندانی یا زیادہ سے زیادہ ایک قوم کا دین بنا دیا تھا۔

بنی اسرائیل میں سے بے شک مسیح علیہ السلام کی تعلیم غیر اسرائیلی لوگوں تک پہنچی اور ان کے حواریوں نے صابیوں یعنی ''آرین'' قوموں میں بھی مسیحیت کی اشاعت کی لیکن ہوا یہ کہ خود بنی اسرائیل نے مسیح علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہود ان کی تعلیم سے بہت کم مستفید ہوئے، عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا لیکن حضرت مسیح کے ماننے والوں نے یہود کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب تورات کی سب سے زیادہ اشاعت کی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی ان کشمکشوں کا اثر قریش کے اہل الرائے بزرگوں پر بھی پڑتا رہا۔ انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے کس طرح بڑی سلطنتیں قائم کر لی ہیں مگر اس کے ساتھ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ عیسائی، ابراہیمی دین سے دور ہو گئے ہیں اور حنفی ملت کی قیادت سنبھال نہیں سکے۔ یہودی تو ابراہیمی دین کی اشاعت میں ناکام ہو ہی چکے تھے، اس سلسلے میں عیسائی بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئے، قصی کی اس جدید تنظیم کے بعد قریش مکہ میں یہ حوصلہ پیدا ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی بڑا آدمی پیدا ہو جو ابراہیمی دین کی دعوت دے اور اس کے قیام کا مرکز بنے۔

قریش کا مکہ میں آباد ہونا اور قصی کے بعد ان میں ایک خاص قسم کی جماعتی زندگی کی ابتداء، اسے میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ سمجھتا ہوں، اس دعاء کی تکمیل یونہی ہو سکتی تھی کہ ایک امت ہو جو دنیا کی تمام امتوں کی ہدایت کیلئے اٹھے پھر اس امت کو بھی ایک امام کی ضرورت تھی جو اسے تعلیم اور تزکیہ کے ذریعہ دنیا میں ابراہیمی دین کی اشاعت کیلئے

تیار کرے۔

قریش کی امتیازی حیثیت

مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عرب کے دیگر بدو قبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا، صحیح نہیں، صحرائی و بدوی زندگی اور اس کے لوازمات و خصائص جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے، قریش ان سے بہرہ مند تو ضرور تھے۔ لیکن عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے۔ قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قصی کے زمانہ سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا۔ نیز تجارتی فاصلوں کی وجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا موقع ملتا تھا، اور حج وعکاظ کے میلے کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ ورسم پیدا ہو جاتے تھے، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدنی سرمایہ اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کی بدویانہ خصائل سے بھی نابلد نہ تھے، چنانچہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کیلئے اجنبی نہ تھے، وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم و حکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھیں ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے، البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ وہ ادھر توجہ نہیں کرتے تھے۔

قریش کا تمدن

قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے، قرآن کا خطاب تو قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا، مکہ میں قریش کا اپنا ایک باقاعدہ انتظام تھا، تجارتی اور سیاسی معاملات سلجھانے کیلئے قواعد وضوابط تھے، قومیت کا ان کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں ایسی مذہبی رسوم بنالی تھیں جو ان کے مادی اور جماعتی مفاد کیلئے مفید تھیں اور اس وجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا اور موجودہ عہد کے ایک محقق کے الفاظ میں ''متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادی یک نسلی نہ رہی تھی،

اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے، خزاعہ یمن کے تھے، مکہ والوں کی رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے۔ قصی کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ قصی کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے، جہاں تک قانون کا تعلق ہے حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم ہونے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعہ کا پتہ نہیں چلتا لیکن قانون معاہدہ اور قانون جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے۔ حتی کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم سے بچنے کیلئے ''حلف الفضول'' کے نام سے ایک رضا کارانہ نظام بطور تہدید وتدارک وجود میں آ گیا تھا، لیکن مکہ کے اس نظام میں چند بنیادی خامیاں تھیں جن کی بناء پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی، مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا امیر طبقہ مال مست تھا تجارت اور سرمائے سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کیلئے حبشی غلام خریدتے اور حظ نفس کیلئے لونڈیاں لاتے، چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں اور شراب کا دور چلتا، سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام سے گزر ہوتا تو وہاں سے عیش وعشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے، مکہ کا یہ گنا چنا اوپر کا طبقہ اس لہو ولعب میں منہمک تھا لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی۔

دنیا کا مشکل ترین مسئلہ اور اسلام

دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کیلئے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطہ نظر متعین کرنا لازمی ہوا، وہ انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کشمکش رہتی ہے، صلح وصفائی اور میل ملاپ کی

راہ پیدا کرنا، امیر وغریب کا فرق، آسودہ حال و قلاش کی چپقلش، زمینداروں اور کسانوں کا تفاوت، زرداروں اور بے زروالوں کی آپس میں کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی باہمی بے اعتمادی، اس کشمکش، اس اختلاف اور اس دشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے، دور کرنا ہر صاحب مذہب اور نئے نظام کا فرض ہوتا ہے، اس لحاظ سے اپنے زمانہ ظہور میں اسلام کو بھی اس مسئلہ کا حل کرنا ضروری تھا چنانچہ مذہب اسلام اعلان جنگ تھا، ظالم، فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف جو پسماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہم پرستی سے فائدہ اٹھاتے تھے، مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے رنگ ونسب کے عجیب وغریب تصورات بنا رکھے تھے۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعہ سے روا رکھی جاتی تھی، مذہب ہو یا سیاست تجارت ہو یا اجتماع، ان سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے۔

رسول اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں

قریش کے سربرآوردہ طبقے اگر اسی رو میں بہتے چلے جاتے تو ان کا انجام صاف نظر آرہا تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے قریش کی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی، قریش اگر راہ راست پر آجاتے تو ان کے ذریعے عربوں کی اصلاح ہو سکتی تھی اور اگر عربوں جیسی جنگ جو اور جری قوم قریش کی قیادت کو مان لیتی تو رسول اللہ ﷺ کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچ سکتا تھا، بے شک رسول اکرم ﷺ ساری دنیا کیلئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کا پیغام سب قوموں کیلئے تھا لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح وتہذیب ہو جائے تاکہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی اور دوسری عمومی و بین الاقوامی اور آپ کی قومی حیثیت کا مظہر قریش کی قیادت تھی، آپ کی بعثت کی بین الاقوامیت اور عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام

صرف قریش تک محدود نہ رہا بلکہ ان کے ذریعے عام عربوں تک پہنچا اور پھر دوسری قومیں بھی زمرہ اسلام میں داخل ہوگئیں بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ ''جناب رسول اللہ ﷺ میں دو خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں، ایک نبوت اور دوسرے ان کے ذریعے قریش کا برتری اور عزت حاصل کرنا، نبوت ہر قوم اور ہر نوع کیلئے عام تھی، سرخ اور کالے سب کیلئے، مشعل نبوت سے نور حاصل کرنے کے معاملے میں وہ سب برابر تھے'' (تفہیمات جلد ۱)

جب تک بعثت محمدی ﷺ کی یہ دو حیثیتیں پیش نظر نہ ہوں اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنا بڑا مشکل ہے مؤرخوں نے غلطی سے ان دونوں حیثیتوں کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ ان کی باتیں پڑھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسلام خالص عربی تھا وہ صرف عربوں کیلئے تھے، عربوں نے اسے بلند نام کیا، وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آیا اور اب اگر اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب اٹھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں۔ گو عجمی قوموں نے تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کر لیا، لیکن وہ مسلمان ہوئی تو اپنے ساتھ الحاد و زندقہ کے جراثیم بھی لیتی آئیں اور ان کی وجہ سے ''حجازی'' اسلام کا صاف اور پاکیزہ چشمہ گدلا ہوگیا' اس ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ عربی زبان کو مقدس محض مان لیا گیا، عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا اور قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع قرار پایا، جب کہ اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام اور قرآن کو ان پریشان خیالیوں سے نکالا جائے، بیشک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے لیکن جہاں تک بعثت محمدی ﷺ کی عمومیت کا تعلق ہے سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں، قریش اور عرب کی یہ برتری استحقاق کی بناء پر تھی، اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں، اسلام جتنا حجازی ہے اتنا وہ عجمی بھی ہے اور اتنا ہی ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔

مکی عہد

الغرض بعثت محمدی ﷺ کی قومی حیثیت کی تکمیل تو یوں ہوئی کہ قریش کے ایک ممتاز

گروہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا، چنانچہ یہی لوگ نئی تحریک کے چلانے والے بنے، اس گروہ کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے جو اس نئی تحریک کے مخالف تھے، لڑنا بھی پڑا، یہ مکہ کی رجعت پسند طاقت تھی بارہ تیرہ سال تک مکہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑے زور کی کشمکش رہی، ایک طرف رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت حمزہ، حضرت سعید اور حضرت مصعب رضوان اللہ علیہم وغیرہم، نوجوان تھے اور دوسری طرف خود آپ ﷺ کے حقیقی چچا اور دوسرے عمر رسیدہ سردار ابوجہل، ابولہب، ولید، عتبہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے، ان رجعت پسندوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا، وہ اس جماعت کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے، جو حضرت بلال اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما جیسے لاوارث اور کمزور تھے ان کو بدنی سزائیں دی جاتیں اور جو قریش کے خاندانوں میں سے تھے، ان کا یہ لوگ مذاق اڑاتے، عام مجلسوں میں ان پر پھبتیاں کستے اور موقع ملتا تو مار پیٹ بھی کر دیتے۔ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں کم تھا اور اگر کھلم کھلا لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو شاید ان کو ہزیمت اٹھانا پڑتی لیکن اس کے باوجود عرب میں جہاں کی روایات یہ تھیں کہ ایک شخص ہزار کے مقابلے میں ڈٹ جاتا اور جان دیدیتا لیکن دوسرے کے ظلم کو برداشت نہ کرتا خلاف معمول مکہ کے یہ افراد خاموشی سے قریش کے مظالم سہتے اور حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم جیسے جانباز اور غصہ ور بہادر بھی ہاتھ نہ اٹھاتے۔

بات یہ ہے کہ انقلاب برپا کرنے کیلئے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جماعت اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ انقلاب کے پیغام کو ان تک نہ پہنچایا جائے، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس پیغام کو سمجھیں اور ان کے دلوں میں یہ پیغام رچ بس جائے، وہ اس پر ایک عرصہ تک عمل بھی کریں، اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرنا بھی سیکھیں اور ان امتحانوں میں پڑ کر جب وہ نکلیں تو اس قابل ہوں کہ انقلاب کیلئے اپنی جانیں دے سکیں۔ تیاری کے دور میں عدم تشدد پر عمل کرنا مفید بلکہ ناگزیر ہوتا ہے چنانچہ تاریخ میں اکثر مقدس ہستیوں

نے عدم تشدد کی پالیسی پر ایک خاص مدت کیلئے عمل کیا ہے۔ مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال اس انقلابی جماعت کی تربیت میں گزرے۔

مدنی دور

ہجرت کے بعد مدینہ میں یہ جماعت جو مکہ میں انقلاب کی پوری تربیت پا چکی تھی، اپنی حکومت بناتی ہے اور مدینہ کے وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہو چکے تھے اس کے ''انصار'' بنتے ہیں اور مکہ کی رجعت پسند طاقت اس نئی حکومت سے برسرِ نزاع ہوتی ہے تو رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی انقلاب کو بچانے کیلئے میدانِ رزم میں اترنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بدر کی جنگ میں اس رجعت پسند طاقت کا زور، توڑ دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد مکہ والے احد میں اپنی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے میں قدرے کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر دو سال بعد خندق کا واقعہ پیش آتا ہے، اس میں مکہ والوں کے ساتھ عرب کی دوسری رجعت پسند طاقتیں یعنی یہود اور بدو قبائل مل کر مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں لیکن وہ اس مجموعی طاقت سے بھی انقلاب کے مرکز کو سر نہیں کر پاتے، یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے اور مدینہ کی انقلابی حکومت بتدریج آگے قدم بڑھاتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ سے نکلے آٹھ سال ہی ہوئے تھے کہ قریش کی ساری کی ساری جمعیت نے انقلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، مکہ کا فتح ہونا تھا کہ عرب کے دوسرے قبائل بھی جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے اور عرب کے اِس سرے سے لیکر اُس سرے تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ رسول اللہ ﷺ رحلت فرماتے ہیں تو سارا عرب مدینہ کی نئی حکومت اور اسلام کے نئے نظام کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کی پہلی منزل۔

قریش کے تصورِ قومیت کی اصلاح

رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور فیضِ صحبت سے اب قریش اور ان کے پیرو یعنی ان کے دوسرے عرب بھائی بند اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے پیغام اور ان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتے، ایک لحاظ سے یہ قدم قریش کی قومیت ہی کی ارتقائی شکل تھی، اسلام نے دراصل قریش

میں اب تک قومیت کا جو محدود تصور تھا، اسے دوسرے معنی دے دیئے تھے، اسلام نے قریش کی قومیت کو، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، مٹایا نہیں بلکہ اسے بحال رکھا، البتہ اس کا دائرہ وسیع کر دیا، اسلام قومیتوں سے انکار نہیں کرتا وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے۔ وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے، یہ ناممکن ہے اور نہ فطرت اس کو گوارا کرتی ہے، اسلام نے قریش کے محدود قومی تصور کو یوں بدلا تھا کہ اب دوسری قوموں کے اچھے آدمی بھی قریش کی اس اصلاح شدہ قومیت میں شامل ہو سکتے تھے، اسلام سے پہلے قریش کی قومیت صرف مکہ کی چار دیواری تک محدود تھی اور خاص مکہ میں بھی قریش الگ تھے اور غیر قریش عناصر جن کی تعداد غالباً قریش سے کچھ کم نہ تھی، الگ تھے، اگر قریش ابولہب اور ابوجہل کے قومی تصور پر چلتے رہتے اور خون اور نسل ہی کو اپنے محدود معنوں میں معیار قومیت مانتے چلے جاتے تو قریش کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اس کے برعکس اسلام نے اس قومی تصور میں اتنی وسعت اور صلاحیت پیدا کر دی کہ ایک طرف وہ تصور ساری عرب قوم پر مشتمل ہو گیا اور دوسری طرف دیگر قوموں کے اچھے افراد بھی اس قومیت کے انسانی پہلوؤں کو اپنانے کیلئے تیار ہو گئے، قریش اس نئی قومیت کے ترجمان اور قائد تھے اور عرب اور دوسرے لوگ ان کے ساتھی اور سپاہی۔

قریش کی قیادت پر دنیا میں مقصد بعثت محمدی ﷺ کو نافذ العمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس بار کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کر دیا، چنانچہ ان کے ذریعے ہی چین سے لیکر فرانس تک بسنے والی خدا کی مخلوق اسلام سے متعارف ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش آپس میں لڑے اور ان کی انقلابی جماعت نے اپنے رجعت پسند بھائی بندوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہمارے خیال میں ابوجہل، ابولہب اور اس قبیل کے نامور قریش سرداروں کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت و دیانت سے انکار نہ تھا اور سکون و اطمینان کی گھڑیوں میں وہ آپ ﷺ کو نعوذ باللہ کاذب اور مفتری بھی نہ کہتے ہوں گے لیکن ان کو اعتراض یہ تھا کہ بلال ایک

حبشی زادہ ''لا الہ الا اللہ'' کہنے سے ابوبکرؓ، عثمانؓ اور زبیرؓ جیسے اصیل ونجیب قریشیوں کا کس طرح بھائی بن سکتا ہے۔ رؤسائے مکہ کی نظروں میں جو چیز ناممکن تھی، قریش کی اس جماعت نے اسے امر واقعہ کر دکھایا، ابوجہل و ابولہب کا معیار قومیت غلط قرار دیا گیا اور فتح مکہ کے دن قریش کی خاندانی نخوت ونسبی غرور، جوان کیلئے حقیقت میں جان کا لاگو بن رہا تھا، سب خاک میں مل گیا، کعبہ کی چھت پر بلالؓ کی آواز مکہ کی فضا میں بلند ہوئی اور قریش کا خون اور نسل کی برتری کا محدود قومی تصور، جو کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ذریعہ عوام وخواص سے منوایا جاتا تھا، بتوں کے ساتھ وہ بھی رخصت ہو گیا اور اس کے بجائے ایک نیا قومی تصور معرض وجود میں آیا جس میں کوئی بھی قریش کے افکار وخیالات سے متفق ہوتا، باسانی سما سکتا تھا، اسلام کی دعوت ''لاقومیت'' کی دعوت نہیں تھی بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن گئی۔ اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا جو ذہنی لحاظ سے تو اس وقت کا ایک بین الاقوامی شہر تھا، لیکن وہاں کے رہنے والے جسمانی لحاظ سے بدویوں کی سی صحت وتوانائی کے مالک تھے۔ مکہ میں اسلام کے اولین پیروؤں کی جو جماعت بنی، اس میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے ان میں قریش بھی تھے، بلال حبشیؓ جیسے بھی تھے اور صہیب رومیؓ بھی تھے، مکہ سے جب یہ جماعت مدینہ میں منتقل ہوئی تو اس میں عبداللہ بن سلامؓ ایسے یہودی عالم اور انصار کے بڑے بڑے سردار بھی شریک ہو گئے۔ قرآن مجید نے اس جماعت کو ''السابقون الاولون'' کا نام دیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس جماعت میں قریش کی حیثیت سب میں ممتاز تھی لیکن امتیاز صلاحیت کی بنا پر تھا، کسی خاندان یا نسب کی وجہ سے نہ تھا۔ درجہ میں سب لوگ برابر تھے، چنانچہ اس عہد کی یہ ایک صحیح انٹرنیشنل انقلابی جماعت تھی۔

مکہ کے سر ہونے کے بعد جب قریش کے بچے کھچے عناصر بھی نئی جماعت میں شامل ہو گئے تو یہ جماعت اتنی قوی ہو گئی کہ عرب کی سرزمین میں کوئی عرب یہودی یا عیسائی ان کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، چنانچہ عرب کے تمام قبائل اپنے قبیلہ یا قوم پرستیوں سے تائب ہو کر قریش کی نئی قومیت کا حصہ بن گئے اور سب نے قریش کی قیادت کو تسلیم کر لیا، حجۃ الوداع میں جو رسول

اکرم ﷺ کا آخری حج تھا ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ سے زائد نفوس تھے اور سب کی زبانوں سے ''لبیک اللھم لبیک'' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، سب کا ایک خدا، ایک نبی، ایک قوم اور ایک شاہراہ زندگی تھی۔

ردانقلاب کی ناکام کوشش

لیکن عرب سے رجعت کے جراثیم ابھی پوری طرح فنا نہیں ہوئے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے رحلت فرماتے ہی عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ردانقلاب کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چنانچہ مدینہ اور مکہ کی اس جماعت کو دوبارہ عربوں کو بزور شمشیر فتح کرنا پڑا اور انہیں قریش کی قیادت ماننے پر مجبور کیا گیا۔ ارتداد کا طوفان بڑا سخت تھا لیکن انقلابی جماعت کے ایمان اور ہمت سے یہ بلا ٹل گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ارتداد کے خلاف جو بڑے بڑے معرکے ہوئے ان میں پیش پیش مکہ کے نوجوان قریشی تھے، جن کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے ارتداد حقیقت میں عرب کے بدو قبائل کی رجعت پسندی کا مظاہرہ تھا۔

قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافت راشدہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ صحابہؓ آپ ﷺ کے کاموں کو جاری رکھتے ہیں یہ ''السابقون الاولون'' کی جماعت تھی انہوں نے آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا، حضرت ابوبکرؓ کے بعد ان کی رائے سے حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور یہی جماعت تھی جنہوں نے باتفاق رائے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جگہ منتخب کیا، حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور اسی جماعت کے غالب حصے نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مانا۔ بے شک اس کی وجہ کوئی خاندانی اعزاز یا نسبی امتیاز نہ تھا۔ جیسا کہ بعد میں غرض مندوں نے سمجھ لیا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ مکہ میں اسلام سے بہت پہلے قصی کے زمانہ سے ہی قریش کی ایک ایسی نسل پل رہی تھی جو عرب کی قیادت کی صلاحیت رکھتی تھی، یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کے خاندان میں سے سمجھتے تھے، اپنے مذہب کو دین ابراہیمی مانتے تھے چونکہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیلی عربوں کے مورث اعلیٰ تھے اور بنی اسرائیل

بھی انہیں کو اپنا بڑا جانتے تھے نیز غیر اسماعیلی یعنی قحطانی عرب بھی اسماعیلیوں سے گھل مل رہے تھے اس لئے ان روایات نے قریش کے ذہنوں میں بڑی وسعت کا امکان پیدا کر دیا تھا۔ دوسری طرف قریش پڑوس کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے مذاہب سے بھی آشنا تھے اور اپنے آپکو ان سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے۔ ان کا پھر تجارتی سفروں کی وجہ سے ان ممالک میں آنا جانا بھی تھا۔ نیز مکے میں رہتے ہوئے، جو عربوں کا دینی اجتماعی اور ایک حد تک تجارتی مرکز بھی تھا وہ عربوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے تھے ان داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر قریش میں سے آئمہ (لیڈرز) کا ہونا ایک قدرتی امر تھا، چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے قریش میں سے ہی امیر کو چننے کے حق میں جہاں اور دلیلیں دی تھیں اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب قریش کے سوا کسی اور کی امارت کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔

مختصراً اسی طرح قریش کا عرب کی قیادت کی سعادت حاصل کرنا بعثت محمدی ﷺ کا ایک لازمی نتیجہ بن گیا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و قریش صحابہ کی طرف سے بحث و مناظرہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے قریش کی قیادت و امارت کے اصول کو تسلیم کر لیا تاہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ہم (قریش) انقلاب کی قیادت کریں گے اور تم (انصار) ہمارے دست و بازو (وزیر) ہو گے۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعد میں جس حدیث ''الائمۃ من قریش'' کے حوالہ سے قریش کی امارت کے حق میں جو دلیل دی تھی بعد میں تاریخی واقعات نے بھی ان کے اس دعویٰ کی تصدیق کر دی۔ چنانچہ عربوں کی جہاں کہیں حکومتیں بنیں قریش کے خاندان کے لوگ ہی ان میں برسر اقتدار آئے۔ امویوں کے وارث عباسی بنے۔ اسپین میں جو عربی سلطنت قائم ہوئی اس کے فرمانروا اموی تھے اور مصر میں قریش ہی کی فاطمی شاخ اپنی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، امویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا دور ختم ہوا تو عرب بھی مسند اقتدار سے برطرف کر دیئے گئے اور ان کی جگہ مسلمانوں کی دوسری قوموں نے لے لی۔

جماعت صحابہ میں اختلاف رائے

حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ تک مرکزی جماعت کا اتفاق قائم رہا۔ اس عہد میں صحابہ کی دو جماعتیں بن گئیں، ایک جماعت سمجھتی تھی کہ اگر حاصل شدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ نہ کی گئی تو سلطنت میں بڑا انتشار پیدا ہو جائے گا، پھر ایک طرف بدو عرب بھی بے قابو ہو رہے تھے اور دوسری طرف مفتوحہ اقوام ہنوز پوری طرح مطیع نہ ہوئی تھیں۔ اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کیلئے عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس کے خلاف دوسری جماعت عربیت کو مؤخر اور ابتدائی زمانہ کی اسلامیت کو مقدم رکھنا چاہتی تھی چنانچہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں یہ کشمکش زوروں پر رہی۔ مرکزی جماعت کے اس اختلاف سے عربوں کے شورش پسند طبقوں نے فائدہ اٹھایا اور حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ ان شورش پسند عربوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا یہ دراصل بدوؤں کی پرانی نراجی ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔ بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش نظر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کو تازہ کرنا تھا لیکن ان کو کوفہ اور بصرہ میں جن لوگوں سے سابقہ پڑا وہ عہد اول کی بلند نظری تو کجا، عربی تنظیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بلند نصب العین واقعی قابل تعریف تھا لیکن جن لوگوں کے ذریعہ وہ اس نصب العین کو عمل میں لانا چاہتے تھے، وہ بین الاقوامی تنظیم تو کیا، قومی تنظیم سے بھی ناواقف تھے، ان کے خلاف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے منظم کر کے اسلام کا محافظ بنانا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے شام والوں کو عربیت کے نام سے جمع کیا۔ نصب العین تو ان کا بھی اسلام رہا لیکن ان کا یہ نصب العین عرب قوم کا قومی مسئلہ بن گیا۔

خانہ جنگی کی حقیقت

ہمارے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلافت کے دور میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں انہیں یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک یہودی

مفسد یا چند بدطینت منافقوں کی سازش کا نتیجہ تھا، ٹھیک نہیں، خود انصاف فرمایئے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا نظام سب سے برتر اور اعلیٰ ہے اور جن بزرگوں نے اس نظام کو عملی شکل دی وہ دنیا کے بہترین لوگ تھے۔

اگر یہ صحیح ہے اور ہم مانتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ایک یہودی یا چند نابکار اس نظام کو آسانی سے درہم برہم کر دیتے۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے تو لامحالہ کہنا پڑے گا کہ اسلام کا نظام اور اس کے کارفرما نعوذ باللہ اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کا لگایا ہوا پودا ایک معمولی سے جھکڑ کا مقابلہ کر سکتا۔ کسی نظام کی برتری اور اس کے نافذ کرنے والوں کی عظمت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام نافذ کرنے والوں کے بعد بھی قائم رہے اور نہ صرف قائم رہے بلکہ اور ترقی کرتا جائے ورنہ تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم میں کوئی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی اور اس نے ایک مختصر مدت میں قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا لیکن جونہی وہ شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی اس کے ساتھ اسکی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہو گئی۔

خدانہ کرے اگر تاریخ اسلام کے ان نظریات کو مان لیا جائے جو آئے دن ہمارے بڑے بڑے ''ارباب علم و فضل'' پیش کرتے ہیں اور اپنے ان نظریات کی بناء پر دنیا سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ ان کے نظام کو سب نظاموں سے افضل اور مفید تر مان لے گی جو بقول ان کے صرف تیس برس تک ٹھیک چلا اور جس کے ان تیس برسوں کے بھی آخری دس سال آپس کی لڑائیوں اور خونریزیوں میں گزرے۔

بات یہ ہے کہ انقلاب کے ہنگامے میں ہر مزاج اور ہر رجحان کے آدمی باہم مل جاتے ہیں ان کا یہ اتحاد داخلی سے زیادہ خارجی اسباب کی بناء پر ہوتا ہے انہیں چونکہ مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی دشمنی اور عداوت ناہم جنسوں کو بھی اکٹھا کر دیتی ہے چنانچہ ہر خیال کے آدمی جن کا نصب العین انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے اس جماعت میں شریک ہوتے ہیں۔ انقلاب کی کشمکش میں جہاں ہر آدمی کو مرنے مارنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا،

طبیعتوں کے یہ اختلافات ابھرنے نہیں پاتے اور جماعت میں یکجہتی قائم رہتی ہے لیکن جونہی مخالف قوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور سامنے کوئی فوری اور سخت خطرہ نہیں رہتا تو پھر دبے ہوئے جذبات ابھرتے ہیں شروع شروع میں نظری اختلافات ہوتے ہیں، پھر ہر خیال کا ایک گروہ بن جاتا ہے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خود انقلابی جماعت آپس میں پھٹ جاتی ہے اور دوسروں سے لڑنے کے بجائے یہ باہم دگر لڑنے لگ جاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی انقلاب برپا ہوا ہمیشہ ہنگامہ انقلاب کے سرد پڑتے ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی لیکن یہ خانہ جنگی انتشار یا زوال کی علامت نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کام کرنے کے متعلق مختلف رائیں ہو جاتی ہیں اب اگر ہر ایک رائے کو مان لیا جائے تو جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ ایک رائے والے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالیں لیکن دوسرا فریق بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی دلیل و منطق سے وہ قائل نہیں ہوتا اس لئے لازمی طور پر تلوار سے معاملہ کو نبٹانا پڑتا ہے۔

پارلیمنٹری نظام میں یہ جھگڑا عام انتخاب کے ذریعہ طے ہو جاتا ہے اور تلواروں کی بجائے ووٹوں سے جمہور فیصلہ کر دیتے ہیں کہ کونسا فریق برسر اقتدار ہو۔ ہارنے والی جماعت اس فیصلے کو تسلیم کر لیتی ہے لیکن غالب فریق شکست خوردہ جماعت کو خارج از بحث نہیں کر دیتا بلکہ اس کو شریک حکومت بناتا ہے اس سے مشورے لیتا ہے اور بعض دفعہ اگر ان کا مشورہ صحیح سمجھے تو اسے قبول بھی کر لیتا ہے۔ ہارنے والی جماعت، غالب فریق کی حکومت صرف اس لئے تسلیم کر لیتی ہے کہ اسے یہ امید ہوتی ہے سال، دو سال یا پانچ سال کے بعد ہم پھر جمہور سے استصواب رائے کر سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اب کے ہم غالب آئیں۔ لیکن یاد رہے کہ پارلیمنٹری نظام صرف امن وامان اور عام حالات ہی میں چل سکتا ہے اس کے برعکس کسی انقلاب کا ہونا خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ملک کے حالات غیر معمولی تھے۔ اس لئے باتوں اور رایوں کی بجائے تلواروں سے کام لینا پڑا۔ اس سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انقلابی طبعاً خون آشام ہوتے ہیں آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ لوگ جن کو اپنی دعوت انقلاب کے سلسلہ میں تلوار چلانی پڑی ان میں اکثر ایسے تھے کہ جو

بڑے رقیق القلب تھے وہ بچوں کے ساتھ ہوتے تو بالکل معصوم بچے بن جاتے، وہ طبیعت کے بے حد نرم اور مزاج کے بڑے ٹھنڈے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے زمانے کے لوگ دلیل کی بجائے محض تلوار کو حکم اور پنچ مانتے تھے چنانچہ ان بزرگوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی اور جب انقلاب میں تلوار چلی اور تلوار ہی حکم ٹھہری تو ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد خود انقلابی جماعت میں جو اختلاف ہوا اس کا فیصلہ بھی تلوار سے ہوا، حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور اس عہد کی دوسری لڑائیاں دراصل دورائیوں کا تصادم تھا، عام حالات ہوتے تو دونوں جماعتوں میں ووٹوں کے ذریعے فیصلہ ہو جاتا لیکن وہ زمانہ اور تھا ہر شخص شمشیر بند تھا اس لیے اس کی رائے کا اظہار شمشیر ہی سے ہوا۔

بے شک رسول اللہ ﷺ کے بڑے ممتاز اور قریبی صحابہؓ میں تلوار چلی۔ اسلام کے مخالف اس پر ہنستے ہیں، اور جو مسلمان ہیں وہ ان کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئیاں بیان کرتے ہیں دبی زبان میں کچھ کہتے، تو بعد میں جو بات کہی تھی اسے ان کہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی نظر سے دیکھا جائے تو سارے معاملات واضح ہو جاتے ہیں اور کسی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی، اور دل میں کچھ اور زبان وقلم سے کچھ اور کہنے اور لکھنے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

ایران، شام اور مصر کو فتح کرنے اور کسریٰ کو ختم اور قیصر کو ایشیائی مملکت سے محروم کرنے کے بعد عربوں کا انقلابی جوش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اب حالت یہ تھی کہ ایک بدو مدینہ سے اونٹ پر سوار ہوتا تو اسلامی سلطنت کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے اس کا دم ختم ہو جاتا۔ پہلے عرب اپنے آپ کو مخالف قوتوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اور ہر طرف ان کے ایسے دشمن بھی موجود تھے جن کا سر کرنا ضروری تھا، چنانچہ قدرتی طور پر اس زمانے میں ان کی طبیعتوں کا انقلابی رجحان پورے عروج پر تھا، لیکن جب انہیں اتنی بڑی سلطنت مل گئی اور ان کے سامنے کوئی فوری خطرہ بھی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ اس جوش وخروش میں بھی کمی آ گئی۔ اگر عربوں میں واقعی اس وقت انقلاب کا پہلا سا زور ہوتا تو

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اولوالعزم خلیفہ کو نامساعد حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

عربوں کی قومی حکومت اور بنوامیہ کا عروج

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ''السابقون الاولون'' کا عہد ختم ہوگیا اور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو چلانے والی اس وقت کوئی جماعت موجود نہ تھی جو سب قوموں کی نمائندہ ہوتی بلکہ اس وقت تک عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے بحیثیت مجموعی اسلام کو قبول بھی نہ کیا تھا تو ان حالات میں یقیناً عرب ہی اس تحریک کے محافظ اور علمبردار بن سکتے تھے، اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک عام عربوں کیلئے بین الاقوامی تحریک بن گئی اور اس کی حفاظت اور بقاء ان کی قوم کی موت وزندگی کا سوال ہوگیا۔ اور لامحالہ اسکا اثر حکومت کی روش پر بھی پڑا، گو اسلام کی بین الاقوامیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی لیکن عملاً عربوں نے آہستہ آہستہ اس بین الاقوامیت کو اپنے قومی دائرہ میں لے لیا کیونکہ اس وقت اس کے بقاء کی صرف یہی صورت ممکن تھی، اگر عرب اسکو اپنا قومی مسئلہ نہ بنالیتے تو اسلام کی بین الاقوامیت مختلف عناصر کی کھینچا تانی کے ہاتھوں کبھی منڈھے نہ چڑھ سکتی۔

جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنالیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ برسرعروج ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنوامیہ کو ملی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی اور اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے۔

عام عربوں کا رجحان بنو ہاشم کے مقابلہ میں امویوں کی طرف زیادہ تھا اور اس کے اپنے اسباب ہیں۔ علوی، خاندانِ رسالت میں ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد امویوں کا برسراقتدار آنا حقیقت میں اسلامی اصولوں سے کسی قسم کی بغاوت نہ تھی، بلکہ اموی دور، اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ ہمارے تاریخ نگاروں نے بنوامیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنوامیہ کے

سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تخت وتاج کے وارث بنے، انہیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پہلے ہم بھی بنوامیہ کے خلاف اپنے مؤرخوں کی باتیں پڑھ کر متاثر ہو جاتے تھے لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان کو جانا تو ہم پر اموی دور کی اصل حقیقت واضح ہوگئی۔ جس زمانہ میں بنوامیہ کے خلفاء، سلطنتوں کے مالک ہوئے اس زمانہ میں بادشاہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسئولیت سے بالا سمجھتے تھے لیکن یہ عدم مسئولیت صرف شخصی اور نجی زندگی تک محدود ہوتی۔ جہاں تک قوم اور ملک پر حکومت کا تعلق تھا اس کیلئے ایک معین دستور اور قانون تھا اور جو بادشاہ یا فرمانروا اس مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کرتا، اسکی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی، بدقسمتی سے ہمارے تاریخ نگاروں نے فرمانرواؤں کے ذاتی حالات اور خانگی زندگی کے واقعات کو تاریخ میں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحہ عمل کو نیا رنگ دے۔ شروع شروع میں تو قوم کے سارے کے سارے افراد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں اور اگر کسی سبب سے حرب وضرب کا سلسلہ رک جائے تو ان میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ میں یہی ہوا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو سمجھا اور انہوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی۔ اور عرب بحیثیت قوم کے اس کے حامل ومحافظ بن گئے، چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کو پایہ تخت بنایا اور اپنا بحری بیڑہ (جو سترہ سو جہازوں پر مشتمل تھا) تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب جو آپس میں لڑلڑ کر فنا ہو رہے تھے پھر متحد ومتفق ہوگئے اور خشکی وتری میں ان کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔ ہم نے بنوامیہ کی غلطیوں کو تو خوب اچھالا لیکن ان کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔ بیشک امویوں نے اسلامی حکومت کو

قومی اور عربی رنگ دیا لیکن انہوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی قومی حکومت کے تابع نہ بنایا۔ چنانچہ عہد اموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا، دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی۔ یہ صحیح ہے کہ اموی حکومت کے ایوانوں میں غیر عرب مسلمانوں کو بار نہ ملتا تھا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت کے علاوہ جماعتی اور تمدنی زندگی کے جتنے بھی ادارے تھے ان سب میں غیر عربی مسلمان پیش پیش تھے اور جمہور ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے، اسی زمانہ کی بات ہے کہ حضرت حسن، جو بصری کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں اور وہ غیر عرب تھے، اپنی تقریروں میں اموی حکومت پر نکتہ چینی کرتے، ہزاروں کا مجمع ہوتا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی اذیت کے درپے ہوتا۔

الغرض اموی حکومت کی سیاست تو بیشک عربی امتیاز کو لیے ہوئے تھی لیکن اس سیاست سے جو علمی نتائج مرتب ہوئے وہ مفتوح قوموں کے حق میں بے حد مفید تھے۔ عربی فتوحات نے مفتوحہ ملکوں کی قوموں کے اوپر طبقے کو جن کے ہاتھ تلے ان کے عوام بری طرح کچلے جا رہے تھے، ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ نیز جہاں جہاں عرب فاتح گئے ان کے ساتھ اسلام گیا۔ فتوحات کا سیلاب تو آیا اور گزر گیا لیکن اسلام کے عقائد جس جس سرزمین پر پہنچے وہاں کے لوگوں کی ذہنی اور جماعتی زندگیوں کو بدلتے چلے گئے، پہلے کے مذاہب جو بے جان اور بے روح کھلونے بن چکے تھے، اسلام کے فکری طوفان کے سامنے خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے، پرانی دنیا اپنی تمام فرسودگیوں کے ساتھ رخصت ہوئی اور تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسا پایا تھا اور اس کی کیا کایا پلٹ کر دی۔ اسلام کے اس زریں کارنامے کی صدائے بازگشت غیر مسلم مورخین کی زبانی سنئے۔ ایم این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ''اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی، جس نے عرب قبائل کو متحد کر دیا، کچھ ہی عرصہ بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشیائی وافریقی صوبے آ گئے جو قدیم متزلزل نظام سے نکلنا چاہتے تھے، عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی، وہ اپنے کمزور

کندھوں پر خانقاہیت (رہبانیت) کا بوجھ لئے کانپ رہی تھی، ایسے نازک وقت میں عربستان سے امید کی کرن پھوٹی، اسلام کی تلوار بظاہر خدا کی خدمت کیلئے بلند ہوئی، لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگ بنیاد رکھا جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور (بیکار) قدیم مذاہب کو موت کی گہری نیند سلادیا"۔

اسلام کے اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور اجتماعی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے۔

"اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانہ کی عربی تہذیب کے اثر اور اسکی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی، ایرانی، بازنطینی اور قبطی ... ایک لاعلاج کاہلی کا شکار ہورہے تھے اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ عربوں سے ربط وضبط پیدا ہونے کی وجہ سے انکی سستی دور ہوگئی اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہوگئی"۔

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی لیکن اسلامی انقلاب سے جو شاندار اور دوررس نتائج برآمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی، اموی فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہوسکے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ اس وقت ممالک فارس وروما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ایک نیا سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لیکر اٹھے اور تاریک دنیا میں علم کا نور پھیلادے۔ مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور روم کے ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔

بنوامیہ کی عربی حکومت نے ایک تو ممالک فارس وروم کے کھنڈرات صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو

عام بھی کیا، اس طرح مفتوحہ ممالک کی قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر مجبور ہوگئے۔ موسیو لیبان کے الفاظ میں ''خوں ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں دیا گیا تھا، از سر نو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے افق روشن ہو جاتا ہے یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت وجلال کے ایک شاندار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔

عباسی دور اور نیم آزاد سلطنتیں

اسلام کے عالمگیر انقلاب کی دوسری منزل یہاں ختم ہوتی ہے اور عباسیوں سے اسکے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے پہلے دور میں قریش سارے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتے ہیں دوسرے دور میں قریش اور عرب مل کر دنیا کے ایک وسیع رقبے کو اسلام کے زیر اثر لے آتے ہیں۔ گو عہد اموی میں حکمران طبقوں میں عربی رنگ غالب تھا لیکن اہل علم، اسلام کی عمومی حیثیت کی بڑی شدومد سے اشاعت کرتے رہے، چنانچہ اس عمل اور ردعمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر عرب مسلمان بھی حکومت میں مساوی حیثیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ اموی عرب پہلے کی طرح عرب قومیت کو ہی اشاعت اسلام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک صدی میں کتنی اور قومیں مسلمان ہو چکی ہیں اور اب ان کے وجود کا انکار کر کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ عباسیوں نے بدلتے ہوئے زمانے کی اس ضرورت کو سمجھ لیا اور وہ ایرانیوں کو ساتھ ملا کر امویوں سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہوگئے۔ عباسی دور آتا ہے تو عرب اور غیر عرب مسلمان مل جل کر حکومتیں قائم کرتے ہیں۔ گو اخلاقی سیادت عربوں کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں پر غیر عرب چھا جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ عربوں کا اخلاقی اقتدار بھی کم ہو جاتا ہے، اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایرانی اور ترکی قومیں اسلام کے بین الاقوامی مرکز کی مالک بن جاتی ہیں اور عربوں کی حیثیت دوسرے درجہ کی رہ جاتی ہے۔

مدینہ منورہ اسلام کے اولین بین الاقوامی اور انسانی دور کا مرکز تھا، دمشق خالص عربی قوموں کا مرکز بنا، بغداد میں عرب امیر اور ایرانی وزیر تھے، ایرانیوں نے بغداد کی عباسی خلافت کے زیر تربیت حکومت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی، شروع شروع میں تو ایرانی دبے رہے، اور اگر چہ عباسی خلفاء نے عربی سیادت کو برقرار رکھنے کی بڑی کوشش کی، چنانچہ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون نے، جب بھی انہیں موقع ملا اپنے ایرانی وزراء اور امراء کو جو سلطنت میں بڑے دخیل اور صاحب قدر تھے، بے دریغ قتل کروایا، اور ایران کے قدیم افکار کو جو اسلام پر غالب آنے یا اسے اپنے رنگ میں رنگنے کیلئے سر اٹھا رہے تھے، بڑی سختی سے کچلا لیکن ہارون کے بیٹے مامون کا اپنے بھائی امین کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دراصل عربوں کے خلاف ایرانی عنصر کی فتح تھی، اس عہد میں خلافت کی فوج میں عربوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔ مامون کے بعد معتصم اور واثق کا زمانہ آیا تو ترک، جنہیں ہم تمدنی اعتبار سے ایرانی ہی کہتے ہیں، خلافت عباسی کے سیاہ وسفید کے مالک ہو گئے۔ مامون نے اپنے عہد خلافت میں غیر عرب مسلمانوں کو حکومت کا اہل پا کر انہیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے بھی دیئے اور بعض کو تو صوبوں کی مستقل حکومتیں بھی عطا کیں۔ اسی زمانہ سے عباسی خلافت کے ماتحت شرق وغرب میں نیم آزاد سلطنتیں بننا شروع ہوتی ہیں۔ جو اپنے اندرونی معاملات میں تو مستقل تھیں، لیکن حاکمیت بالا عباسی خلفاء ہی کی تسلیم کرتی تھیں، چنانچہ مشرق میں بخارا، غزنی اور بعد میں دہلی کی سلطنتیں وجود میں آئیں اور ادھر مغرب میں مصر اور مراکش کی حکومتیں بنیں۔ اس طرح تقریباً پانچ سو برس اسلام کی مرکزی قوت عرب اقوام کے ہاتھ میں رہی۔ ان اقوام کی امامت قریش نے کی۔

عربی دور حکومت کا جائزہ

قرآن حکیم کی اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش تھا، قریش کی امامت تقریباً پانچ سو سال تک رہی، اس کے ابتدائی دور میں قریش میں وہ بارہ سردار ہوئے۔ جن کی خوشخبری رسول اللہ ﷺ نے دی تھی (ان میں چاروں خلفاء راشدین، امیر معاویہ رضی اللہ عنہم، عمر بن عبدالعزیز،

عبدالملک، اس کے چاروں صاحبزادے اور ایک پوتا ولید بن یزید شامل ہیں) ان سرداروں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مٹا کر دنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر اسلامی سلطنت قائم کی۔ اس حکومت کو اگر سیاسی شعور کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ انسانیت کیلئے ایک نمونے کی حکومت تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''میری حکومت کو دیکھو اور غور کرو، کوئی اندھا نہیں جس کیلئے میں نے عصا بردار مقرر نہ کیا ہو، اور کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے جس کو کھانا اور دوا نہ پہنچتی ہو''

ولید بن عبدالملک کی حکومت ایک عرب سردار کی حکومت تھی، خلیفہ راشد کی حکومت نہیں، خلفائے راشدین کی حکومت تو گویا ایک مثالی حکومت تھی۔ تاہم قریش کے ان دیگر سرداروں کی حکومت بھی کچھ کم شاندار نہ تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی حکومتوں کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ بے شک یہ لوگ شاندار زندگی گذارتے تھے مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع اور اس کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے اور رعایا کے عمومی مفاد کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے مؤرخین نے تاریخ کو اجتماعی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بحیثیت مجموعی کسی تحریک، حکومت یا اجتماع کو دیکھتے وہ حکمران کی خانگی زندگیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخوں میں ان فرمانرواؤں کے ذاتی اور شخصی نقائص بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مؤرخ کے نزدیک جس خاندان کو حکومت ملنی چاہیئے تھی اس کی بجائے اس کے مخالف کو حکومت مل گئی اور اول الذکر کی مؤخر الذکر سے جنگ ہوئی، ظاہر ہے کہ ان حالات میں ''قلم بدستِ دشمن'' کا معاملہ تھا اس لیے یہ مؤرخ ان حکمرانوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے وہ کم تھا۔

ہمیں چاہیئے کہ اب ہم تاریخ کو اس طرح نہ پڑھیں بلکہ ایک حاکم نے عام انسانیت کیلئے جو کچھ کیا ہمیں اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اگر شاہان اسلام کے اجتماعی کام اچھے تھے تو ان کے شخصی نقائص اور ان کا اوروں سے تھوڑا بہت مالی تفوق (یعنی اوروں سے مال کی

زیادتی) یہ ایسی چیزیں نہیں کہ ہم انہیں اتنی زیادہ اہمیت دیں۔ آخر مسلمانوں کے علاوہ اور قوموں میں بھی بادشاہ گذرے ہیں مسلمانوں کے ان حکمرانوں کا ان سے مقابلہ کیجئے۔

بے شک اسلامی حکومتوں کا یہ عہد محدود مطلق العنانی (شخصی حکومت) کا عہد تھا اور فرمانروا جو چاہتے تھے، کرنے کے مجاز ہوتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں ملک میں ایسی بااثر جماعتیں بھی ہوتی تھیں جو ان حکمرانوں میں اعتدال پیدا کرتی تھیں اور ان کو حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا کرتی تھیں۔ یہ فقہاء اور صوفیاء کی جماعتیں تھیں فقہاء قانون کو نافذ کرنے میں بالکل آزاد تھے، ایک فقیہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا اور ساری قلمرو کے قاضی اس کے ماتحت ہوتے، چنانچہ بادشاہ ان قاضیوں کے فیصلوں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون بادشاہ کی سیاست سے آزاد رہتا اور اسکی سلطنت میں ایک مستقل حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ ملک کا دوسرا عنصر جو ان حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے آڑے آیا کرتا وہ صوفیاء کا گروہ تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ متوفی ۵۶۱ء بغداد میں اپنی خانقاہ میں بیٹھے خلفاء کے احکامات پر تنقید کیا کرتے اور خلفاء تھے کہ آپ کی ان باتوں کو شیر مادر کی طرح پی جاتے۔ عربی حکومت کا یہ آخری دور تھا اس سے پہلے جب عربی حکومت میں زیادہ قوت تھی اور اس کے فرمانروا بڑی طاقت واقبال کے مالک تھے تو وہ صوفیاء اور زاہدوں کی صحبت اور نصیحت کو اپنے لیے سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے خطیب بغدادی نے خلیفہ ہارون الرشید کے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں۔

عجم کی اہمیت: سورۃ جمعہ میں جہاں اس امر کی صراحت یعنی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ "امیین" یعنی عربوں کیلئے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کیلئے بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے، سورۃ جمعہ کی پوری آیت یہ ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین واخرین منهم لما یلحقوا بهم وهو العزیز الحکیم:

(ترجمہ: وہی ذات اقدس ہے جس نے ''امیین'' میں سے ان کیلئے رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ نیز اس ذات اقدس نے اس رسول کو ان لوگوں کیلئے بھیجا ہے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ بے شک وہ ذات بڑی عزت والی اور حکمت والی ہے)

ہمارے نزدیک ''وآخرین منھم'' کے مصداق اہل ایران، اہل ہند اور دیگر عجمی قومیں ہیں جو بعد میں شامل ہوئیں۔ یا آئندہ ہوں گی، ''امیین'' کیلئے رسول اللہ ﷺ کی بعثت یہ تو اسلام کا قومی منصب تھا۔ اور ''آخرین منھم'' کو ہم قرآن کی بین الاقوامی تعلیم کا حاصل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت جیسے عربوں کیلئے تھی ویسے ہی عجمیوں کیلئے بھی ہے۔ اب ''آخرین منہم لما یلحقوا بھم'' (یعنی بعد میں آکر ملنے والے لوگوں کا) کا زمانہ آتا ہے، اور عربوں کے بجائے یہ لوگ اسلام کی بین الاقوامیت کے محافظ اور سرپرست بنتے ہیں۔ اگر اسلام کو صرف عربی اقوام کیلئے معین کر دیا جائے تو غیر عرب مسلمان اقوام نے جو بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں، وہ اسلامی اجتماع پر ایک دنبل (پھوڑا) بنکر رہ جائیں گی لیکن اگر بعثت محمدی ﷺ کی دونوں حیثیتیں یعنی قومی اور عمومی ملحوظ رہیں تو قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آجائیں گے۔ بے شک عرب اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر کے دکھایا جو قیامت تک انسانی نسلوں کیلئے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کیلئے نمونہ کا کام دیں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کی مرکزی حکومت کمزور ہونے سے اسلام ہی ختم ہو گیا۔

چنانچہ کئی سو سال تک اسلامی دنیا کی یہ حالت رہی کہ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی جگہ آزاد تھا اور نظم ونسق سلطنت میں وہ کسی دوسری طاقت کو اپنا حاکم بالا نہ مانتا تھا لیکن اس کے باوجود بغداد میں اور پھر قاہرہ میں ایک نام کی اسلامی خلافت قائم رہی، جس کے ساتھ دور ہی سے عقیدت کا اظہار کرنا سلاطین وملوک کافی سمجھتے تھے۔ یہ اسلامی خلافت حقیقت میں اسلام کے اس تصور کی

یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہؓ کے زمانے میں ایران فتح ہوا قریش کی اموی خلافت کے دوران نومسلم ایرانیوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا، عباسی آئے تو اسلامی ایران ان کے ساتھ مل کر حکومت کا کام سیکھنے لگا، اس طرح خلفائے عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کیلئے تیار کر دیا۔ بغداد میں تو خلفاء عباسیہ کے وزراء اور ماتحت کی حیثیت سے وہ اسلامی سلطنت میں شریک تھے لیکن ادھر مشرق میں انہوں نے اپنی مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھی چنانچہ جب بغداد زوال کے نرغے میں آیا تو مشرق میں بخارا کی حکومت کا زور بڑھ گیا۔ بخارا کی حکومت کمزور پڑ گئی تو غزنی کا ستارہ چمکا۔ غزنی سے عجمی مسلمانوں کا مرکز لاہور میں منتقل ہوا، اور لاہور آگے چل کر دہلی کے مرکز کا پیش خیمہ بنا، اب اگر اسلام کو محض عربی اقوام تک محدود کر دیا جائے اور عربوں کا عروج وزوال اسلام کے عروج وزوال کے مترادف سمجھ لیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے اہل علم کا دستور بن گیا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی یہ تمام محنتیں جو بغداد، بخارا، غزنی، قاہرہ اور دہلی کے مرکزوں کو با اقتدار اور شاندار بنانے میں صرف ہوئیں یہ سب بیکار تھیں اور یہ سارے کے سارے مرکز اسلامی اجتماع کے حق میں دنبل (پھوڑا) سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے ہم نے اسلام کی اساسی حکمت کو بین الاقوامی قرار دیا ہے اور ہم قرآن عظیم کو انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت کا حامل سمجھتے ہیں اس وقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو جماعت یا گروہ بھی قرآن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں ہو، خواہ وہ عربوں میں سے ہو یا عجم میں سے وہ سب کے سب ایک ہی درجے پر سمجھے جائیں، چنانچہ اسی بناء پر ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد کو پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجے پر آجاتے ہیں اور جس طرح ہم قریش میں کسی خاص خاندان کا امتیاز نہیں مانتے اسی طرح ہم اسلامی ملت میں عربوں کی انفرادیت کے قائل نہیں اور ان کی قومی برتری یا شخصی بڑائی کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ بے شک عرب اسلام کی اجتماعی تحریک کے امام ہیں اور انہوں نے سب سے

پہلے اسلام کے اصولوں پر ایک اجتماع کی تشکیل کی۔ اس لحاظ سے وہ تمام انسانی نسلوں کیلئے قیامت تک قرآن کی اجتماعی زندگی کا ایک نمونہ ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب عربوں کی مرکزی قوت کمزور ہوگئی اور ان کا اقتدار باقی نہ رہا تو خدانخواستہ اسلام بھی ختم ہوگیا۔ ہمارے نزدیک امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملے کی جس قدر عزت اور قدر و منزلت ہے، سلطان محمود غزنویؒ کی کشور کشائیوں کی بھی ہم ویسی ہی قدر کرتے ہیں۔

عجمی عہد حکومت

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھا اس دور میں زمام اقتدار کلیتاً غیر عرب مسلمان اقوام میں آ گئی اور خود عرب قوم اور ان کا ملک تک عثمانی ترکوں کے ماتحت ہوگیا، ان مسلمان اقوام پر ان کے ''قومی'' بادشاہ ہی حکومت کرتے تھے۔ یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندے نہ تھے کہ ان کے عزل و نصب کا اختیار جمہور کو ہوتا ہے کہ یہ تلوار کے زور پر تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور جو ان میں سے صالح ہوتا وہ البتہ جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا، آہستہ آہستہ بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئے اور آخر کار ''شاہیت'' اپنے محکوموں کیلئے وبال جان بن گئی، بدقسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان ''بادشاہوں'' کو جواب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، مسند اقتدار سے الگ کر کے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور دنیائے اسلام قومی شاہی حکومتوں کی بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہو کر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کر دیا، یا انہیں اپنی مرضی کے تابع بنالیا۔ لیکن مسلمان جمہور خواب غفلت میں پڑے سوئے رہے اور اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی کی گئی تو جابر بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بار آور ہونے نہ دیا۔

قومی جمہوری تحریکات کی تخم ریزی

حسن اتفاق دیکھئے کہ اس ''شاہیت'' کے آخری دور میں کم و بیش ایک ہی زمانہ میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جن کے مخاطب جمہور تھے، یہ تحریکیں قومی اور جمہوری تھیں انکے بانیوں

کے پیش نظر ساری دنیا اسلام نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے، عثمانی ترکوں کے ہاں اس تحریک نے ''تنظیمات'' کی شکل اختیار کی، عربوں میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے، شمالی افریقہ میں امیر عبدالقادر نے قوم کی زمام قیادت سنبھالی، مصر میں خدیو محمد علی اہل مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے، ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظم کرنے کی کوشش کی، بدقسمتی سے ان تحریکوں کا آغاز ہی ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو تقریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے، مشرقی ملکوں پر پل پڑے اور بجائے اس کے کہ وہاں قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمانی حکومتیں بنتیں، یورپ والے بیچ میں آ گئے اور تمام دنیائے اسلام ان کی ستمگاریوں سے تہہ و بالا ہو گئی۔

۱۹۱۸ء سے اسلامی دنیا میں ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے اسلامی ملکوں میں ایک صدی پہلے جن قومی جمہوری تحریکوں کا بیج بویا گیا تھا گو یورپ کے سیلاب نے اسے برگ و بار لانے کا اس وقت موقع نہ دیا لیکن وہ بیج اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہا، اور جونہی گذشتہ جنگ عظیم ختم ہوئی اور محکوم قوموں کو سر اٹھانے کی فرصت ملی تو تقریباً ہر اسلامی ملک میں عوام نے آزادی کیلئے جدوجہد شروع کر دی۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے قومی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی، مصر میں سعد زغلول نے قومی پارلیمنٹ بنائی۔ شام، فلسطین، طرابلس، تیونس اور مراکش وغیرہ میں بھی قومی تحریکیں اٹھیں لیکن وہاں کے جمہور اپنی آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہندوستانی مسلمان بعض مخصوص حالات کی بناء پر اپنے ملک کی قومی تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔

قومی جمہوری دور

دنیاء اسلام میں یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے۔ اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں، اور نہ کسی اسلامی ملک کے جمہور سے مطلق العنان بادشاہ کی جابرانہ حکومت ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن مسلمان باشاہوں نے رعایا کے خلاف مرضی من مانی حکومت کرنی چاہی ان کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے اور جس مسلم قوم نے دوسری مسلم قوم پر

زبردستی حکومت کرنے کی کوشش کی اس کا انجام گذشتہ جنگ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے معاملہ میں واضح ہو چکا ہے الغرض اس دور میں ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ کسی نام سے بھی اپنے ملک میں دوسروں کی دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا اور نہ وہ دوسروں کے سر پر اپنی حکومت تھوپنے کا روادار ہے۔ چنانچہ ہر قوم اپنی زبان کو ترقی دے رہی ہے افغان، پشتو کی ترویج کر رہے ہیں، ایران میں فارسی کو زندگی کے ہر شعبے میں لازمی بنادیا گیا ہے۔ عربی بولنے والی قومیں عربی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہیں اور ترک تو زبان کے معاملہ میں کافی نام پیدا کر چکے ہیں، اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی حامل کوئی ایک قوم نہیں رہی ان چودہ سو برسوں میں اسلام کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اب عربوں کے علاوہ اور قومیں بھی مسلمان ہو چکی ہیں۔ لہذا اب اگر کبھی کوئی بین الاقوامی اسلامی ادارہ بنے گا تو اس میں ساری مسلمان قومیں برابر کی شریک ہوں گی یعنی ہر مسلمان قوم اور ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہوگا اور پھر یہ آزاد قومیں اور ممالک باہم مل جل کر کسی بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل کریں گے۔

الغرض اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ ان مختلف ادوار میں سے گزر چکی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک جبکہ ساری امت متفق و متحد رہی، اسلامی حکومت کا مثالی دور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو برس عربی قومی حکومت اور ''السابقون الاولون'' کی مثالی حکومت کی بیچ کی کڑی ہیں، امیر معاویہ رضی اللہ سے مسلمان عربوں کی حکومت شروع ہوتی ہے اور خلیفہ ہارون رشید پر عربی سیادت کا دور ختم ہو جاتا ہے، مامون الرشید سے زوالِ بغداد تک عباسی خلافت کے زیر سایہ عجمی قومیں برسر اقتدار آتی ہیں۔ زوال بغداد سے عربیت کا کلی خاتمہ ہو جاتا ہے اور خالص ترکی دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں ترکی کی آخری نشانی یعنی عثمانی سلطنت کا چراغ سحری بجھ جاتا ہے اور یہاں سے قومی جمہوریتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

اسلامی بین الاقوامیت کا مستقبل

ہمارا یہ دور قومی جمہوریتوں کا دور ہے لیکن یہ قومی جمہوری رنگ اسلام کی بین الاقوامی

روح کے خلاف نہیں، مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ پہلے تو وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد ہوں اور آگے چل کر یہ آزاد اکائیاں اپنی کوئی بڑی وحدت بنالیں، لیکن اس وقت تو مقدم یہ ہے کہ ہر ملک آزاد ہو، اسلامی بین الاقوامیت اس کے بعد کی چیز ہے۔ اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستے پر چل رہے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کہ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی یا مافوق قومی حکومت ہی ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے اور پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرض وجود میں آسکے۔ اگر ان کی یہ بات تسلیم کرلی جائے تو نعوذ باللہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام بحیثیت ایک نظام سلطنت کے ان تیرہ سو سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا اور اب اس کے دوبارہ ابھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں، اور جب اسلام کے نظام کی دیرپائی کا یہ عالم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متاثر ہوگی۔ اسلام اور اس کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں اسلام کے ساتھ دشمنی کررہے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں اگر ان دعاوی کو عملی نقطہ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہ ان دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔ اسلام کے اس طرح کے نظریہ ساز پہلے تو اسلام کے متعلق ایک موہوم تصور پیش کرتے ہیں اور جب اپنی گردوپیش کی زندگی اور ماضی کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے اس موہوم تصور کو عملی جامہ پہنتے نہیں دیکھتے تو پھر اپنی ایک خیالی دنیا بساتے ہیں لوگوں کو اس دنیا میں آباد ہونے کی بڑی گرم جوشی سے دعوت دیتے ہیں اور چونکہ اس کیلئے محض خیالی آفرینی شرط ہے اور ماحول سے چھیڑ چھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا اس لیے عمل پر خیال کو ترجیح دینے والے ذوق وشوق سے ادھر متوجہ ہوجاتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہورہا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ

خود تو کچھ نہیں کر پاتے اور نہ خیالی دنیا سے کبھی باہر قدم رکھتے ہیں لیکن جو لوگ عملی زندگی کی دشواریوں، رکاوٹوں اور آلائشوں کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی قوم جس پستی میں وہ ہے، اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن حالات میں وہ قوم گھری ہوئی ہوتی ہے ان حالات کے مطابق قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک مردود اور گھٹیا انسان ہیں دوسرے لفظوں میں جو کہے اور کچھ نہ کرے وہ مجدد ملت اور جو کچھ کرنے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کام ہمیشہ گردوپیش کے حالات کو مدنظر رکھ کر ہی ہوسکتا ہے اور اس کیلئے بلندی سے نیچے اترنا پڑتا ہے، وہ مردود ٹھہرے۔

نام پمفلٹ	تاریخ اسلام۔ایک معروضی مطالعہ
افکار	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
ترتیب	پروفیسر محمد سرور مرحوم
طبع دوم۔	جون ۲۰۰۶ء
ناشر۔	شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن پوسٹ بک نمبر ۹۳۸ گلگشت ملتان۔

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدر و قیمت	مفتی عبدالخالق آزاد	ولی اللہی نظام فکر کی عصری اہمیت	مولانا بشیر احمد لدھیانوی
اجتماعی مسائل کا ولی اللہی حل	جناب مقبول عالم (بی اے)	دین وحدت	مولانا سید سلیمان ندوی
شعوری تقاضے	مولانا شوکت اللہ انصاری	ولی اللہی جماعت کا انقلابی کردار اور ہماری ذمہ داریاں	مفتی عبدالخالق آزاد
جدوجہد اور نوجوان	شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ	آزاد قومی پالیسی کا خاکہ	مولانا سید محمد میاںؒ
اسلام کا اقتصادی نظام ایک تقابلی جائزہ	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	عزیمت (۴)	(ادارہ)
ولی اللہی تحریک	مولانا سید محمد میاںؒ	عزیمت (۲)	(ادارہ)
امام شاہ عبدالعزیزؒ افکار اور خدمات	مولانا سید محمد میاںؒ	مولانا سندھیؒ کا ایک اہم مکتوب	(ادارہ)
نظام کیا ہے؟	مفتی عبدالخالق آزاد	جہاد کیا ہے؟	مولانا سید سلیمان ندوی
فرد اور اجتماعیت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ اور ان کے جانشین	مفتی عبدالخالق آزاد
عبادت و خلافت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	خانقاہ رائے پور	مفتی عبدالخالق آزاد
حضرت مولانا محمد الیاس کا تصور دین	مفتی سعید الرحمٰن	عزیمت (۳)	(ادارہ)
غلبہ دین اور عبادات	چوہدری افضل حق مرحوم	غلبہ دین اور اس کے اجتماعی تقاضے	مولانا عتیق حسن
شاہ خدا وندی	چوہدری افضل حق مرحوم	تقویٰ کیا ہے؟	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
جدوجہد آزادی کا راہنما ادارہ	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	دین حق اور برصغیر کا سامراجی نظام تعلیم	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
دینی تمدن کی تشکیل نو	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	ترقی کا مادی تصور	مفتی سعید الرحمٰن
استعماری مظالم اور ملی تقاضے	شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ	عدم تشدد کی حکمت عملی (اسوۂ حسنہ کا ایک مطالعہ)	مفتی سعید الرحمٰن
شریعت، طریقت اور سیاست	مولانا محمد الیاس دہلویؒ مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	عزیمت (۵)	(ادارہ)
قرآنی دعوت انقلاب	مولانا عبیداللہ سندھیؒ	تبدیلی نظام کیوں اور کیسے	مفتی عبدالخالق آزاد
دین اور حکومت	مولانا سید سلیمان ندوی	ولی اللہی فکر کا تاریخی تسلسل	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
تبدیلی نظام کا ولی اللہی نظریہ	مفتی عبدالخالق آزاد	اسلام اور گروہیت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
آزادی	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	سماجی تبدیلی کی حکمت عملی	مفتی سعید الرحمٰن

پوسٹ بکس نمبر 938 پوسٹ آفس گلگشت ملتان